

باسمہ تعالیٰ

لمعات

(مملکت اسلامی کب بنتی ہے)

ہم شروع سے مسلمانوں کی مملکت اور اسلامی مملکت میں فرق کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اسلامی مملکت کے مسئلہ میں جو سوالات سامنے لائے جاتے ہیں اور اس کی جو تفصیلات ہم سے پوچھی جاتی ہیں ان کا تعلق مملکت (یا اس کی حکومت) کی ہیئت کذائی سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ جمہوری ہوگی یا آمرانہ۔ جمہوری ہوگی تو اس کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ منتخب ہوگی تو طریق انتخاب کس قسم کا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مملکت (یا دنیا کی کسی اور مملکت) اور اسلامی مملکت میں ماہہ الاستیذان کی ہیئت کذائی یا شکل و صورت نہیں۔ ان میں حقیقی فرق بنیادی ہے۔ اسلامی مملکت کی بنیاد ایمان پر جوتی ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے سے ثبات کا واضح ہو جانا تو ایک طرف، اس سے مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا صحیح تصور ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ ہماری نئی نسل کو تو چھوڑیے، قدیم نسل کے ہاں بھی ایمان سے مراد چند الفاظ کا دھڑلینا ہوتا ہے اور بس۔ جہاں تک کاروبار حیات اور معاملات حکومت کا تعلق ہے ان پر ایمان کی اہمیت کو ہمیں نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کسی کے ذہن میں اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک اس بنیاد کا صحیح تصور ہمارے سامنے نہ ہو، عام ملکوں (حتیٰ کہ مسلمانوں کی ملکوں) اور اسلامی مملکت کا فرق ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر کہتے چلے آ رہے ہیں لیکن..... ہماری جیشہ تعلیم یافتہ نسل کی طرف سے جن سوالات کا اعادہ ہوتا رہا ہے، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کی روشنی میں اس موضوع کی اہمیت کو سامنے لایا جائے۔ ان نو حمانانہ نکتہ کی طرف سے جس قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں، ان کا لحظہ یہ ہے:-

- (۱) قرآن مجید جن باتوں کو اخلاقی محاسن قرار دیتا ہے۔ مثلاً سچ بولو، بھوٹ نہ بولو، کسی کو فریب نہ دو، چوری نہ کرو، عصمت کی حفاظت کرو، کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو۔ کسی کو ناحق ستاؤ نہیں، غریبوں کی مدد کرو۔ محتاجوں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرو۔ و غیرہ وغیرہ۔ ایک شخص ان امور کا پابند ہے لیکن وہ نہ خدا کو مانتا ہے نہ وحی کو، نہ رسالت پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ تو اس کے اس انکار سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور جو شخص ان امور پر ایمان رکھتا ہے اس میں اور اقول الذکر میں عملی نقطہ نگاہ سے کیا فرق ہوتا ہے؟
- (۲) ایک قوم اپنے ہاں (مثلاً) وحی اقتصادی نظام رائج کر لیتی ہے جسے مشرک آن تجویز کرتا ہے لیکن وہ دم خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ تو اس کے اس اقتصادی نظام کو اسلامی کیوں نہیں کہا جاسکتا۔ یا
- (۳) مسلمانوں کی کوئی مملکت ایسے معاشی نظام کو اپنے ہاں رائج کر لیتی ہے جسے قرآن نے تجویز کیا ہے

نور باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جاسکے گا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سسٹم) کس وقت اسلامی کہلائے گا مستحق سمجھا جائے گا۔ یہ ہے شخص ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ آئیے، ہم ان پر سطح سے ذرا نیچے اگے کر غور کریں۔

ۛ

ان سوالات اور اسی قسم کے دیگر شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا ان حیوان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، فلان خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریے اور ملحد کہتے ہیں۔ ہمارے سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کتے کتے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں۔ ایمان انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ، یا (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسانی زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی پچھلے عام حیوانی پھول کی طرح، زور مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا — کھاتا، پیتا، سوتا، جاتا اور افزائش نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد طبعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان ایک متمکن حیوان واقع ہوا ہے، اس کے لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلنے رہتے ہیں۔

ایک نظریہ زندگی یہ ہے اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں۔ اس کی طبعی زندگی حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے طبعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے طبعی قوانین سے ماوراء ایک اور ضابطہ قوانین کی ضرورت ہے جنہیں مستقل اقتدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقتدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہے نہ سوسائٹی کی۔ یہ ازل اور ابدی ہیں اور انسان کو ان کا علم اس وحی کی مدد سے حاصل ہوتا ہے جو انبیاء کو ایم پر نازل ہوئی تھی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمال حیات، مستقل اقتدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عدالت کی، یہ خدا کے قانون مکافات کی مدد سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں اور امٹہ ہوتے ہیں۔

یہ ہے زندگی کا دوسرا نظریہ۔ اس نظریہ کو علم و بصیرت اور عقل و فکر کی مدد سے منہی برصافت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیش نظر رکھنا، ایمان کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبعی زندگی کے نظریہ حیات کو قرآن کھڑے تعبیر کرتا ہے، وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَدِّ مَعُونٍ وَيَا كَلُونْ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ۔ (پہلا) ”جو لوگ

خود باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جاسکے گا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سسٹم) کس وقت اسلامی کہلائے گا سچا جائے گا۔
یہ سے مختص ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ آئیے، ہم ان پر مطلع سے ذرا نیچے آکر غور کریں۔

۰

ان سوالات اور اسی قسم کے دیگر شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا فوجوان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، فلان خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریے اور ملحد کہتے ہیں۔ بنا بریں، سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کتے کسے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں۔ ایمان انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ، یا (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسانی زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی وجود عام حیوانی پھول کی طرح، نر و مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا — کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا اور افزائش نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد، طبعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان ایک متمکن حیوان واقع ہوا ہے، اس کے لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلنے رہتے ہیں۔

ایک نظریہ زندگی یہ ہے اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں۔ اس کی طبعی زندگی حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے۔ طبعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے طبعی قوانین سے ماوراء ایک اور ضابطہ قوانین کی ضرورت ہے، جنہیں مستقل اقتدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقتدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہے نہ سوسائٹی کی۔ یہ ازل اور ابدی ہیں اور انسان کو ان کا علم اس وحی کی مدد سے حاصل ہوتا ہے جو انبیاء کو اہم پر نازل ہوئی تھی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمال حیات، مستقل اقتدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل لے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں مجبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عدالت کی، یہ خدا کے قانون مکافات کی مدد سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں اور امثالہ ہوتے ہیں۔ یہ ہے زندگی کا دوسرا نظریہ۔ اس نظریہ کو علم و بصیرت اور عقل و فکر کی مدد سے معنی برداشت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیش نظر رکھنا، ایمان کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبعی زندگی کے نظریہ حیات کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے، وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمِلُوا كَالْإِنْعَامِ— (پہلا) ”جو لوگ

حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور مر جاتے) ہیں وہ کفر کا نظریہ حیات رکھتے ہیں۔ یہ دونوں نظریات حیات ایک دوسرے سے متضاد ہیں، باہم دیگر متضاد اور منقرض ہیں۔ یعنی ان میں باہم دیگر آمیزش نہیں ہو سکتی۔ ایمان کے نظریہ حیات کے ساتھ کفر کی آمیزش نہیں ہو سکتی، اور کفر کے نظریہ کے ساتھ ایمان کا امتزاج ممکن نہیں: هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (پڑھا) خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن۔ اس شخص کی زبان میں ان نظریات کو فارمولے سمجھنا چاہیے۔ ایک فارمولا اسی صورت میں اپنے نتائج قرب کر سکتا ہے جب اسے بلا آمیزش عمل میں لایا جائے۔ اگر آپ اس فارمولے میں کسی اور فارمولے کی دوسری آمیزش بھی کر دیتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ کبھی مزید نہیں کرے گا۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی آمیزش کو تشکیک کہا جاتا ہے۔ زندگی، ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصوں میں بانٹا ہی نہیں جاسکتا۔ اگر انسانی زندگی کی یہ کیفیت ہو جائے کہ اس کا ایک گوشہ ایک قسم کے نظریہ کے تابع رکھا جائے اور دوسرا گوشہ کسی دوسرے نظریہ کے تحت، تو اس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اَفَتَوْمِنُون بَعْضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ - فَمَا حِزْبًا مِّنْ يَّفْعَلُ ذَٰلِكَ مِّنْكُمْ اِلَّا خَيْرٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَنِزْمًا لِّلْاٰخِرَةِ يَرْدُّوْنَ اِلٰی اَسْوَ الْبَعْدِ اَب (پڑھا) کیا تم اس قسم کا سبک زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو کہ اس ضابطہ حیات کے ایک حصہ پر ایمان لے آئے اور دوسرے سے انکار کر دیا۔ تم میں سے جو کوئی بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی اس کے حصے میں آئے گی اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔ اس لئے جو نظریہ حیات اختیار کرنا ہو اسے بالکل بے اختیار کیا جائے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ یٰۤاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذْ خُلُوْا فِی السَّبْعِ مَكَاتِلَ (پڑھا) اے جماعت مومنین! تم سلامتی بخش نظام حیات (اسلامی نظام) میں پورے کے پورے بہ تمام و کمال داخل ہو۔ اسی صورت میں تم اس کے انسانیت ساز نتائج سے متبع ہو سکو گے۔

پھر اسے بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ اُسی طور پر مذکور ان مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ ہر شخص کو ایمان یا کفر کا نظریہ خود اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا - یا - اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کہتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان کا نظریہ اختیار کرتے ہیں، یا وہ لوگ جو کفر کا نظریہ کا نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ یا مَسُوْیٌ یَّکْفُرُ بِالْاٰمِلٰتِ وَیُؤِیْسُوْا مِیْنَ بَآخِلٍ۔ جو شخص غیر خدا کی نظریہ زندگی سے انکار کرتا ہے اور خداوندی نظریہ حیات اختیار کرتا ہے۔ یعنی ان نظریات کو بالاداد اختیار کیا جاتا ہے۔ مذکور شخص بھروسہ امر کے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو گیا، مومن قرار پاسکتا ہے نہ غیر مسلموں کے ہاں پیدا ہونے والا، پیدائش کے اعتبار سے کافر۔ واضح رہے کہ قومی نقطہ نگاہ سے یہ لوگ مسلمان اور غیر مسلم اقوام سے متعلق سمجھے جائیں گے، لیکن قرآنی مقاصد کے لئے انہیں ایمان یا کفر کا نظریہ اپنے ارادے اور فیصلے سے اختیار کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں سے بھی جو پیدائشی طور

مثال کے طور پر کمپوز میں کیپٹل ازم کی آمیزش کر دیجیے۔ وہ کمپوزم ہے گا نہ کیپٹل ازم کی ازم بھی کسی متضاد ازم کی شرکت سے اپنے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔

کرے۔ اگر جدوجہد ہی نہ ہو تو ایمان، نتائج کیا پیدا کرے گا؟ آپ نہ راعت سے متعلق قوانین سے ہر روز واقفیت رکھیں اور ان قوانین کی صداقت پر آپ کو لاکھ یقین ہو، آپ کی زمین سے فصل اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ ان قوانین کے مطابق کھیتی کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کی ہے۔ مثلاً سورہ عنکبوت میں ہے: **أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا إِنْ هَذَا إِلَّا هُفْوٌ لَا يَفْتَنُونَ** (۱) کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں پھوٹہ دسٹے جائیں گے اور وہ ان پھٹیوں میں سے نہیں گزارے جائیں گے (جن سے گزر کر سونا کنڈن بنتا ہے) سورہ توبہ میں ہے کہ جب منافقین آکر کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جاتا تھا کہ قُلِ اعْمَلُوا۔ فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ۔ (۲) (تمہارا دعویٰ ایمان ہم نے سُن لیا ہے۔ اب تم کچھ کر کے دکھاؤ خدا اور اس کا رسول اور جماعت مومنین تمہارے کام دیکھ کر) اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ تم واقعی ایمان لے آئے ہو یا یہ یونہی رسماً الفاظ کا دہرا دینا ہے، سورہ النعام میں ہے کہ جب قانون مکافات کی رو سے لوگوں کی غلط روش کی پیدا کردہ تباہیاں سامنے آجائیں گی تو اس وقت نہ تو اس شخص کا ایمان اسے کچھ فائدہ دے گا جو ان تباہیوں کو دیکھ کر ایمان لاسے گا۔ **أَوْ كَسِبَتْ فِي أِيْمَانِهَا خَيْرٌ** (۳) اور نہ ہی اس شخص کا ایمان جس کے ایمان کے ساتھ اچھے اعمال شامل نہ ہوں گے۔ اسی سورہ میں دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ خدا لوگوں کے غالی دعوائے ایمان کی بناء پر ان کا دوست اور کارساز نہیں ہوتا۔ **هُوَ وَلِيُّ الْمُشْكِكِينَ** (۴) وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا دوست ہوتا ہے۔ یہ "ایمان بلا عمل" والے ہی ہیں جن کے متعلق کہا کہ **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ** (۵) لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ مومن ہوتے نہیں۔ ایمان انسانی اعمال کے لئے جذبہ محرکہ ہوتا ہے جو جذبہ اعمال کا محرکہ نہیں بنتا، وہ ایمان ہی نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں — مردہ آل ایمان کہ ناید در عمل

(۱)

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا ہے۔ بادی التعمق یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ طبعی نظریہ حیات کی رو سے، اخلاق (MORALS) کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کا تصور تو اقدار (VALUES) سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب طبعی نظریہ زندگی کی رو سے مستقل اقدار کا کوئی وجود ہی نہیں، تو اس میں اخلاق کا تصور کہاں سے آجائے گا؟ آپ سوچئے کہ جو شخص نہ مستقل اقدار کا قائل ہے اور نہ ہی تسلسل حیات یا قانون مکافات کو تسلیم کرتا ہے، وہ اگر کوئی "نیک کام" کرتا ہے تو اس کے لئے اس کا جذبہ محرکہ کیا ہو سکتا ہے؟ توین انگے کے الفاظ میں :-

خدا پر ایمان مرکز ہے اور بقائے حیات پر ایمان محیط۔ تمام مسئلہ اخلاقیات کی بس یہی کلید ہے۔ وہ مستقل اقدار جن کے توسط سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں، ابدی

(GOD AND THE ASTRONOMERS)

اور غیر فانی ہیں۔

(THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ:

راشد، اپنی مشہور کتاب

یہ ناممکن ہے کہ حقیقت کے متعلق ہمارا نقطہ نگاہ علم الاخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو اور اخلاقیات کے متعلق ہمارا نظریہ، تصور حقیقت کو متاثر نہ کرے۔ لہذا اخلاقی قوانین کے مستقل اور مطلق ہونے کے لئے خدا پر ایمان لانا مفک ہے۔

(DESTOJEVSKY) نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:

اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

بات بالکل واضح ہے۔ "خدا پر ایمان" نہ ہو تو نظریہ زندگی طبعی رہ جاتا ہے اور اس نظریہ کی رو سے زندگی، حیوانی سطح پر آ جاتی ہے۔ حیوانی زندگی، بنیادی جبلتوں (BASIC INSTINCTS) کے

سہارے قائم رہتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا جذبہ، تحفظ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہے۔

اس جذبہ کا تقاضا ہے کہ ایک فرد، زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹے، اور چونکہ (حیوانی سطح زندگی پر) مستقل اقدار کا تصور نہیں ہوتا، اس لئے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کے سلسلہ میں "جائز" اور ناجائز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین کا فرما ہوتے ہیں۔

سوا دل تو سوسائٹی کے قوانین سے گریز (EVASION) کی سینکڑوں شکلیں انسان تراش لیتا، اور تراش سکتا ہے۔ دوسرے سوسائٹی کے قوانین، خود ان افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں جو "زیادہ سے زیادہ سمیٹے" میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اس نظریہ کے حاملین سے یہ توقع کرنا کہ وہ جان مار کر محنت کریں اور اپنی محنت کی کمائی میں سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کے لئے دے دیں، اس نظریہ کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ جو شخص یا قوم حیوانی جذبہ تحفظ خویش کے تابع، دوسروں کا سب کچھ سمیٹنے کی فکر میں ہو، وہ اپنا سب کچھ دوسروں کو کیسے دے دے گی۔ اس نظریہ زندگی کے حامل، اگر دوسروں کے لئے کچھ دیں گے بھی، تو اس کا جذبہ محرکہ کچھ اور ہوگا۔ مرد و قانون کا ڈر، ستائش کی تمنا، صلہ کی امید، سوسائٹی میں پاپور ہونے کا جذبہ۔ قرآن کریم اس جذبہ محرکہ کو "دیا و الناس" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ النعام میں ہے۔ وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ آمَ وَالْهِمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ (پہلے) جو لوگ اپنے مال و دولت کو

علا ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ پروفیز صاحب کی تالیف "انسان نے کیا سوچا" یا سب اخلاقیات۔

صاحب اچھے دلائل ہیں "ہنوز ہمارے سامنے مستقل اقدار کا تصور تھا، تو "ریا کاری" کی اصطلاح فریب کاری کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔" وہ بڑا دیا کار ہے۔ اس کے معنی ہی یہ ہوتے تھے کہ وہ بڑا چال باز اور فریب کار ہے، اب ریا کاری، معاشرہ کا عام معمول ہو چکی ہے۔ اسے اب (POPULARITY) سمجھا جاتا ہے۔

لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کس وضاحت سے یہ بات کہی ہے کہ اگر خدا اور آخرت پر ایمان نہ ہو تو پھر انفاق کا جذبہ ہوگا۔ ربنا الناس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے کہ ذین الاغراب من یثخن مما ینفق مخرما (۹) یا ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قانون کے خوف یا حکام کی خوشنودی کے لئے عطیات دیتے ہیں تو چونکہ اس کا جذبہ محرکہ ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتا اس لئے ایسا محسوس کرتے ہیں گویا چٹنی پھیر رہے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں جو لوگ ”انفاق فی سبیل اللہ“ کرتے ہیں۔ یعنی مستقل اقدار اور تسلسل حیات پر ایمان رکھتے ہوئے، دوسروں کی نشوونما کے لئے اپنی کمائی کو کھلا رکھنے والے۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جہنمیں کچھ دیتے ہیں، ان پر کسی قسم کا احسان نہیں دھرتے، انہیں بطور خیرات نہیں دیتے جس سے ان کے جذبہ عزت نفس کو ٹھیس لگے۔ (۱۰) وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جسے وہ ادا کر رہے ہیں۔ ذین اموال یہم حق متعلوہم۔ لیسائل و المخرؤم۔ (۱۱)۔ لہذا، وہ ان سے کہتے ہیں کہ۔ لا تریب متکم حذر آء و لا مشکوٰۃ۔ (۱۲) ہم تم سے اس کا نہ کوئی صلہ مانگتے ہیں نہ ہی ہم شکر یہ تک کے منتہی ہیں۔ اسی لئے جماعت مومنین سے کہا گیا کہ۔

جو کچھ تم ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیتے ہو، اس کا احسان جتنا کر اور یوں ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچا کر، اپنے کٹے کرائے کو ضائع نہ کرو، اس شخص کی مانند جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور لوگوں کو دکھانے کی خاطر، اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ پتھر کی کسی چٹان پر ڈرا سی مٹی پڑی ہو۔ اس پر زور کی بارش پڑے، اور وہ اس مٹی کو بہا کر لے جائے اور وہ چٹان صاف کی صاف رہ جائے۔ اس کے برعکس، وہ لوگ جو مستقل اقدار خداوندی کی رو سے اس ایمان کی بنا پر دوسروں کو دیتے ہیں کہ اس سے ان کی اپنی ذات میں ثبات اور استحکام پیدا ہو جائیگا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اونچی سی زمین پر نہایت عمدہ باغ ہو۔ جب وہی بارش برسے گی تو اس سے باغ میں گولیاں پھیل آئے گا۔ اور اگر وہاں زور کی بارش نہ بھی ہو بلکہ پونہی چھو ہار سی پڑے تو بھی اس کی سیرابی کے لئے کافی ہو جائے۔

(۲۶۵-۲۶۸) ذ (۲۱۶)

اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد، خدا اور آخرت کے ایمان پر ہوگی، اس کے نتائج، تمہاری آئندہ نسلوں تک کو بھی منتہی کرتے رہیں گے۔ یہی وہ اساس محکم ہے جس سے اس زحمت کو پائیداری نصیب ہوگی۔ غلط نظام میں ”نیکوں کے کام“ کچھ وزن نہیں رکھتے، اس لئے کہ ان کا جذبہ محرکہ محکم نہیں ہوتا۔ سورہ توبہ میں قریش کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینا اور کعبہ کی تزئین و آرائش

کر دینا، اس شخص (کے کاموں) کی مانند ہو جائے گا جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں مصروفِ جدوجہد رہتا ہے۔ (تم اپنے ذہن سے جو چاہے فیصلہ کرو) میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (۹)

سورۃ بقرہ میں ہے۔

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف، نیکی یہ ہے کہ تم خدا کی آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لائے گے بعد، اپنے مال کو، اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو.....

(۲۰)

کفر کا نظریہ زندگی رکھنے والوں کے متعلق کہا کہ ”ان کے اعمال کی مثال یوں سمجھو جیسے راکھ کا ڈھیر ہو اور جھکڑ چلے بہت زور کا۔ وہ اُسے اڑا کر لے جائے گا۔“ (۱۲) کفر کے نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی تمام سعی دھل کا منتہی اس دنیا کے مفادات ہی ہو سکتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے۔

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ میں رہنے والے لوگ کون ہیں! وہ جن کی ساری کوششیں اسی دنیا کے مفاد کے حصول میں کھو گئیں اور اپنے دل میں سمجھتے رہے کہ ہم بڑے کارِ بڑے ٹاپال سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ آخرت سے انکار کرتے ہیں۔ سوان کا کیا کر! یا سب راٹینگاں چلا گیا۔ نتائجِ برآمد ہونے کے وقت ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزانِ تک بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔ (۱۸)

(۱۸)

سورۃ محمد میں ہے کہ تم روشے زمین پر چلو پھرو۔ اور پھر دیکھو کہ جن قوموں کا نظریہ حیات، طبعی زندگی تھا، ان کا انجام کیا ہوا؟ (۲۰) ان کے اعمال راٹینگاں گئے اور آخر الامر وہ بڑے خسارے میں رہے۔ (۲۱) ایمان بالآخرت کی اہمیت کے متعلق اشارہ ملتا ہے۔

انسان کے موجودہ اعمال اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال آج ہوں گے اسی قسم کا اس کا ”کل“ ہوگا۔ بالفائدہ دیگر، اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا۔ اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا، کیونکہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ جو یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سرکھپانے کی ضرورت کیا ہے؟

حک قرآن مجید میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ مثلاً (۲۱)، (۲۲)، (۲۳)، (۲۴)، (۲۵)، (۲۶)، (۲۷)، (۲۸)، (۲۹)، (۳۰)، (۳۱)، (۳۲)، (۳۳)، (۳۴)، (۳۵)، (۳۶)، (۳۷)، (۳۸)، (۳۹)، (۴۰)، (۴۱)، (۴۲)، (۴۳)، (۴۴)، (۴۵)، (۴۶)، (۴۷)، (۴۸)، (۴۹)، (۵۰)، (۵۱)، (۵۲)، (۵۳)، (۵۴)، (۵۵)، (۵۶)، (۵۷)، (۵۸)، (۵۹)، (۶۰)، (۶۱)، (۶۲)، (۶۳)، (۶۴)، (۶۵)، (۶۶)، (۶۷)، (۶۸)، (۶۹)، (۷۰)، (۷۱)، (۷۲)، (۷۳)، (۷۴)، (۷۵)، (۷۶)، (۷۷)، (۷۸)، (۷۹)، (۸۰)، (۸۱)، (۸۲)، (۸۳)، (۸۴)، (۸۵)، (۸۶)، (۸۷)، (۸۸)، (۸۹)، (۹۰)، (۹۱)، (۹۲)، (۹۳)، (۹۴)، (۹۵)، (۹۶)، (۹۷)، (۹۸)، (۹۹)، (۱۰۰)۔

یہ ہے ایمان کا تعلق اعمال کے ساتھ۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ ایمان (نظریہ حیات) ہی عمل کے لئے جذبہ محرک بنتا ہے اس لئے اعمال کو ایمان سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ جو جذبہ بھی آپ کے عمل کا محرک ہوگا، وہ آپ کا "ایمان" کہلائے گا۔ ہم اس وقت بات کی وضاحت کے لئے اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ ورنہ قرآن نے صحیح نظریہ زندگی کو ایمان اور غلط نظریہ کو کفر — یعنی صحیح نظریہ سے انکار — کہہ کر بکارا ہے۔ اگر آپ "ایمان" کی جگہ نظریہ زندگی کہہ لیں تو پھر یوں کہا جاسکے گا کہ نظریہ زندگی ان مقاصد کا تعین کرتا ہے جن کے حصول کے لئے انسان کوشش کرتا ہے۔ یوں ایمان، عمل کی بنیاد قرار پا جاتا ہے۔ یہاں وہ حقیقت ہے جس کے تعلق پیکار نے کہا ہے کہ

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی رکسی چیز پر ایمان کرے... جب اسے ایمان کئے لئے کام کی باتیں نہیں ملتی تو وہ ہیکار اور خراب مقاصد پر توجہ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں کو دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اسے اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرت ایک ہی صوٹ ہے۔ اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے۔ بے ماہ روی ختم ہوا اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں ایمان کی حرارت ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

ایمان "در حقیقت انسان کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ" میں ایسا کیوں کروں؟" اور جو شخص مستقل (مبادی حیات) (خدا، وحی، رسالت) اور انسانی ذات (مکانات عمل اور حیات آخرت) پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب دے نہیں سکتا کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنی جان کیوں مارے؟ اگر اس کا جواب کسی دنیاوی فائدے کا حصول نہیں تو جذبہ باقی ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جذبات کسی نظام عمل کے لئے حکم اور پائیدار اساس بن نہیں سکتے۔ اساس حکم تو صحیح نظریہ حیات کی صداقت پر یقین حکم ہی بن سکتا ہے۔ طبعی نظریہ حیات نے اسی اساس حکم کو گم کر دیا ہے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام دونوں کی زندگی جہنم کی سی ہو رہی ہے۔ عصر حاضر کے ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر یونگ نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا ہے کہ

میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیہ نفس کیا، ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس میں زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویہ نگاہ کی کمی نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسانوں کو ہدایت کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جائے جو ان سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی — عقیدہ، امید، محبت، نگاہ خود میں۔ (۲۰۶۴)

ص۔ صحیح نظریہ زندگی قرآن مجید ہی سے مل سکتا ہے اسے ہم علی وجہ الصہرت ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں

